Lr. No 2186-61

Regd. No. A. 922

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

ایک پرچہ

دس نئے پیسے

Telephone No. 39

Telegram "ANJUMAN"

جلد ۲۰ - شمارہ ۲۰ | ایڈیٹر - آل احمد سرور | علی گڑھ - ۲۲ مئی سنہ ۶۱ء

جون ایلیا امروہوی

مصحفی کا جمالیاتی شعور

بڑھنے والے قدم آگے تھے اور اُٹھنے والی نگاہیں پیچھے۔ مصحفی نے صرف دلی سے لکھنؤ کا ہی راستہ نہیں بلکہ زندگی کا راستہ بھی اسی طرح طے کیا ہے اور اسی لئے انھوں نے احساسات کی ہموار و ناہموار راہوں میں بڑے ہی بانکے انداز میں ٹھوکریں کھائی ہیں اور بڑے ہی بانکپن سے سنبھلے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ زندگی کا حقیقی جمال اسی تضاد میں مضمر ہے۔ حالات کی ایک مخصوص رفتار سے مصحفی کو سابقہ پڑا تھا جس نے ان کے کردار اور سیرت کی تشکیل کی اور جس کے زیر اثر جہاں انھوں نے اپنی غزلیں فروخت کیں وہاں آٹھ دیوان بھی مرتب کر لئے۔

اسی سود و زیاں اور اسی سوز و ساز کو ملحوظ رکھ کر انکی شخصیت پر نظر ڈالی جائے تو وہ اپنی زندگی اور اپنے فن سے مخلص بھی نظر آتے ہیں اور غیر مخلص بھی مگر اسی متضاد صورت حال نے ان میں زندگی کی لطیف حقیقتوں اور حقیقی لطافتوں کا صحیح احساس و خلوص اور مزاج حیات و کائنات کا صحیح شعور پیدا کیا۔ کہتے ہیں۔ ؎

دل ٹوٹتا جو ہاتھ سے ساقی کے غم نہ تھا
شیشے کے ٹوٹنے کا مجھے سخت غم ہوا

دیکھئے داخلیت اور خارجیت کے متناقض انداز نے جمالیاتی شعور کا کس قدر حسین امتزاج پیش کیا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مصحفی کے فن میں انفرادیت نہیں وہ دلی اور لکھنؤ کی خارجیت کے درمیان آویزاں نظر آتے ہیں۔ یہ کس قدر رنگین طنز ہے لیکن بہر حال طنز ایک صداقت ہے اور صداقت حسن۔ در حقیقت اسی داخلیت اور خارجیت ہی نے مصحفی کی جمالیاتی حسیات (AESTHATICFEELINGS) کو توانائی بخشی ہے ایک تحقیق یہ ہے کہ جب عالم بالا میں پہلی مرتبہ وحی شعر نازل ہوئی تو بعض شعراء اس وقت کوثر و تسنیم کی طرف ٹہلنے لگے ہوئے تھے اور بعض نڈر اور بے باک جہنم کی طرف نکل گئے تھے مگر مصحفی اس وقت اعراف میں تھے چنانچہ ان کے کلام میں اعراف ہی کی کیفیت پائی جاتی ہے یہ اعتراض ان لوگوں کا ہے جو فنون لطیفہ میں غیر مسولیت کو پسند کرتے ہیں اور جن کے خیال میں شاعری نیز فنون لطیفہ کے دوسرے شعبوں کو جمالی شعور کے بجائے احساس عظمت سے متاثر ہونا چاہئے عظمت و جمال اصلاً یہ دو لفظ دو مکتبہائے فکر و نظر کی علامتیں ہیں جنھوں نے مختلف زاویوں سے حیات اور مظاہر حیات کو دیکھا ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ زندگی کی بارگاہ میں سب سے زیادہ قابل قبول چیز محبت ہے یا عقیدت۔ دنیا کی قدیم ترین ادبیات میں زیادہ تر عقیدت کی تائید کی گئی ہے۔ قدیم یونان کے دو فنکار "سولن" اور "تھیوگنس" اسی نظریے کے حامی ہیں۔ ایشیا میں خامۂ مانی اور نوائے باربد کی عظمت پرستی نے بھی عقیدہ مندی ہی کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ درحقیقت عظمت حسن زندگی کی توجیہ ہے اور جمال اس کی تکمیل۔

مصحفی کے فن کا ہمیں اسی نقطۂ نظر سے جائزہ لینا ہے "عرفی" ہوں یا "نظیری"، "میر" ہوں یا "سودا"، "مصحفی" ہوں یا "انشا" ان تمام سخن سازوں کے فن پر ناقدانہ اور مبصرانہ نظر ڈالتے ہوئے ممکن ہے کہ ہم غور و فکر کے مختلف زاویے اختیار کریں اور مختلف پیمانے بنائیں مگر وہ چیز جو تمام اقدار میں قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہے، وہ ہے شاعر کے وجدانیاتی انفعال کا صحیح اندازہ اور اس کے جمالیاتی شعور کا صحیح تعین۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس نے کائنات کے حسن کی کس انداز میں تکمیل کی ہے اور زندگی کے جلال و جمال سے کس طرح متاثر ہوا ہے اور کس طرح اس کے انفاس پگھل کر شعر کے سانچے میں ڈھل گئے ہیں۔ مگر یہ اسی وقت ممکن ہے کہ جب فن عقیدت مند نہ ہو بلکہ محبت پیشہ ہو۔ "غالب" نے غالباً سب سے پہلے شعوری طور پر ان دو حقیقتوں کی تشریح کی تھی اور ان میں سے ایک کی تائید۔ ؎

خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار
کیا پوجتا ہوں اس بُتِ بیداد گر کو میں

"مصحفی" نے بھی اس بُتِ بیداد گر کو پوجا نہیں بلکہ چاہا ہے۔ انکی شاعری میں ہمیں پرستش و نیائش کی آسودہ کیفیات نہیں ملیں گی بلکہ محبت اور شعورِ جمال کی ناآسودہ تڑپ محسوس ہوگی جس نے ان کے احساسِ حسن کو سنوارا ہے۔ سہ

تیرے کوچے اس بہانے مجھے دن سے رات کرنا
کبھی اس سے بات کرنا کبھی اُس سے بات کرنا

سہ کبھی بیک کے در کو کھڑے رہے کبھی آہ بھر کے چلے گئے
ترے کوچے میں اگر آئے بھی تو ٹھہر ٹھہر کے چلے گئے

یہی وہ تڑپ ہے کہ جس کا سبب شعورِ جمال کی بلند سطح ہے۔ "مصحفی" کو ناسازگار حالات نے غمگین ضرور بنایا تھا مگر وہ غم پسند نہیں بن سکے۔ یہی بات دلّی کے "میر" اور "لکھنؤ" کے "انشا" سے ان کی شخصیت کو جدا کرتی ہے۔ "میر" غمگین بھی تھے اور غم پسند بھی۔ چنانچہ بیان کی جو درد فرسا تندی اور تیزی "میر" کے یہاں محسوس ہوتی ہے "مصحفی" کے یہاں نہیں اور "انشا" نے تو ہنستے ہنستے اپنے منہ کو بگاڑ لیا تھا "مصحفی" ان ہی دو انتہاؤں کے درمیان تھے اسی لئے ہمیں ان کے فن میں زندگی کا دردِ مزہ محسوس ہونے والا حُسن نظر آتا ہے۔

"مصحفی" کے کلام کو سرسبز درختوں کے نیچے بہنے والے چشمے کی ان سبک خرام موجوں سے تشبیہ دی جا سکتی ہے کہ جن پر شام کے سورج کی شہابی کرنوں کا انعکاس بھی ہو رہا ہو اور سرسبز شاخوں کا سُرمئی سایہ بھی پڑ رہا ہو۔ اور یہی وہ دو کیفیتیں ہیں جو "مصحفی" کی یاسیت اور رجائیت کی طرف ایک اشارہ ہیں جن کے امتزاج نے ان کے کلام میں گیسوئے جاناں کا سوگوار حسن اور عارضِ جاناں کا رنگین جمال پیدا کر دیا ہے۔ سہ

برقِ رخسارِ یار پھر چمکی • اس چمن کی بہار پھر چمکی

پھر چمکی ان دو لفظوں میں رعب حسن اور حُسن کی بھرپور ترجمانی کی گئی ہے۔ اگر ہم صرف پہلے مصرعے سے اس وارداتِ قلب کا اندازہ لگانے کی کوشش کریں جو اس شعر کی تخلیق کا سبب بنی تو ہم کچھ دیر کے لئے "مصحفی" کے فنی اسلوب کی توجہ جمال پرستی کی سرحدوں سے آگے عظمت پرستی کی طرف مبذول ہوتی ہوئی محسوس ہوگی۔ جہاں عظمت کا احساس، رعب و ہیبت کی قریب قریب غیر جمالیاتی کیفیت پیدا کر دیتا ہے لیکن جب ہم سُنیں گے کہ "اس چمن کی بہار پھر چمکی" تو کہنا پڑیگا کہ شاعر کا کاروانِ فکر و جمال۔ کہکشاں کی راہ دور دست سے نہیں، بلکہ روشِ گُل سے گذرا ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ یہی اس جہانِ رنگ و بو کے حقیقی جمال کا صحیح شعور ہے۔ حُسن وہی ہے جو ہے اور جو عموماً بے تلاش و جستجو ملتا ہے اور جس کی تکمیل تو ممکن ہے مگر تخلیق نہیں۔ اس کی غیر معقولیت ہمیں عظمت پرستی کے احساس میں اسیر نہیں کرتی بلکہ ہم سے جمال پسندی کی داد چاہتی ہے۔ "مصحفی" کی شاعری اس نظریے کی ترجمان ہے کہ وہ ایسے پھول کا سوگوار حسن لطیف کا ثبوت ہے

جس کی غیر معمولی خوشبو سے زکام ہو جائے اور نہ ایسے پھول کو سونگھ کر خوش مذاقی کی داد دی جا سکتی ہے جس میں سرے سے خوشبو ہی نہ ہو۔ "مصحفی" کے احساسِ جمال میں ہم اسی سادہ جمالیت اور جمالی سادگی کو محسوس کریں گے۔ سہ

دل میں کھپتی ہے نازنیں کی ادا • ہائے رے چشمِ سُرمگیں کی ادا
تیغ رکھ دے کہ قتل کرتی ہے • خود ترے دستِ آستیں کی ادا

یقیناً چشمِ سرمگیں کی ادا ہی کھینچنی چاہئے۔ دشنہ و پیکاں کی ضرورت نہیں۔ چونکہ وہ فطری حُسن کے لئے ناسازگار ہے وہ تیغ رکھ دینے کا اصرار کرتے ہیں اس لئے کہ حُسن مستغنی کو اسکی حاجت نہیں دستِ آستین کی ادا ہی کافی ہے۔

صرف بے رنگی محض ہم رنگی اور فقط ہمہ رنگی کو حُسن سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ وہ تو تنوع۔ نیرنگی اور رنگا رنگی میں پوشیدہ ہے اور نیرنگی بیک وقت ہمہ رنگی سے عبارت ہے۔ جس طرح سطحِ آب کی ہمواری ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے بالکل اسی طرح کوہستانی سلسلوں کی ناہمواری بھی ایک ایسی صداقت ہے کہ جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ وہ "نغمہ" نغمہ ہی نہیں کہ جس کی لہروں میں ایک ہی بہاؤ اور کھنچاؤ ہو۔ "مصحفی" کا یہی وہ جمالیاتی شعور ہے جس نے ان کو اس سادگی کی داد دینے پر بھی مجبور کیا ہے۔

سہ:- سادہ لباس پہنا زیور اُتار رکھا
اس سادگی پہ تم نے لاکھوں کو مار رکھا

اور اس خوش رنگی کی بھی

سہ:- تھا سُرخ پوش وہ گُل شاید چمن کے اندر
شعلہ سا شب پھرے تھا سرو و سمن کے اندر

سہ:- اوّل تو یہ دھج اور یہ رفتار غضب ہے
اس پر ترے پازیب کی جھنکار غضب ہے

سہ:- چھلّے سے ترا رنگِ حنا اور بھی چمکا
پانی میں نگاریں کفِ پا اور بھی چمکا

یونان کے ایک عظیم ترین فلسفی شاعر "فیری سائڈیز سائرس" نے اپنے بسترِ مرگ پر کہا تھا کہ دوست بہت جلد اپنی جماعت کے ایک حکمت دوست رکن کی موت پر سوگ نشیں ہونے والے ہیں کاش وہ زندگی کے اس حُسنِ تناسب کا ماتم بھی کریں جسکی ترجمانی میرے قہقہے اور میرے آنسو کیا کرتے تھے اور اب جس کو موت مٹا دینے والی ہے یہ بات سچ ہے اسی تنوع اور تضاد کی بساط پر حسنِ حیات و کائنات رقص آرا ہوتا ہے۔ "مصحفی" کہتے ہیں: سہ

گر ابر گھرا ہوا کھڑا ہے • آنسو بھی تلا ہوا کھڑا ہے

پہلے مصرعے میں صرف ایک اثباتی انداز اور ایک طرب انگیز صورتِ حال کی منظر نمائی کی گئی ہے مگر صرف اثبات و طرب ہی تو حسن نہیں یہ تو حسن کا ایک جز ہے۔ اس لئے آگے بڑھ کر کہتے ہیں: "آنسو بھی تلا ہوا کھڑا ہے"۔ "مصحفی" کے اس احساسِ جمال کی یہ ایسی عظیم مثال ہے کہ جس سے اس کے احساس کی جودت و جلالت کا پورا پورا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ (باقی صلا پر)

ہماری زبان

۲۲ مئی ۱۹۶۱ء

شری یش پال اور اُردو

شری یش پال ہندی کے مشہور لیکھک ہیں۔ وہ اپنے آپ کو ترقی پسند کہتے ہیں۔ وہ گاندھی جی کے سخت مخالفوں میں سے ہیں۔ کہنے کو وہ اشتراکی نظریۂ حیات کے علمبردار ہیں، مگر زبان کے معاملے میں کسی فرقہ پرست سے کم تنگ نظر نہیں۔ اُردو کی مخالفت کو انھوں نے اپنا مشن قرار دے رکھا ہے۔

جب ۱۹۵۳ء میں ڈاکٹر ذاکر حسین کی صدارت میں دستخطی مہم کے ختم ہونے پر لکھنؤ میں کنونشن ہوا، تو ہندی کے کچھ نادان دوستوں نے اس کنونشن کی نہ صرف مخالفت کی بلکہ اس میں ہنگامہ بھی کرنا چاہا اور چاقو تک چلائے۔ ان ہندی دوستوں کو یش پال کے بیانات سے بڑی مدد ملی تھی۔

یش پال اُردو کو جاگیردارانہ ماحول کی یادگار، درباروں کی نشانی اور مسلم فرقہ پرستی کی زبان سمجھتے ہیں۔ انھوں نے ہندی ہفتہ وار اخبار ہندوستان کی ۱۶ر اپریل کی اشاعت میں ایک مضمون لکھا ہے جس کا عنوان ہے "بدیشی بھاشا کی غلامی سے مُکتی کے لئے نیا طریقہ" کار اپنائیے" اس مضمون میں سب سے پہلے پنڈت نہرو پر طنز ہے اور مردم شماری میں اُن کے ہندی۔ اُردو کو اپنی مادری زبان لکھانے کو شاطرانہ پالیسی کہا گیا ہے۔ اس کے بعد ترنگ میں آکر انجمن ترقی اُردو کی اُردو کے لئے جدوجہد کو دو قومی نظریئے سے ملا دیا گیا ہے۔

یش پال جی فرماتے ہیں کہ "ہندی اور اُردو ایک ہی زبان ہیں مگر ناگری رسم الخط اور فارسی رسم الخط ایک چیز نہیں ہے۔" اُن کے نزدیک "سوال ہندی اور اردو کا نہیں ناگری رسم الخط یا فارسی رسم الخط کا ہے۔" وہ بڑی ڈھٹائی کے ساتھ یہاں تک کہہ دیتے ہیں کہ انجمن ترقی اُردو کی تحریک میں سامپردایک (فرقہ وارانہ) رنگ ہے۔ وہ کمونسٹ پارٹی سے اس بنا پر خوش نہیں کہ وہ اُردو کے حقوق کو بھی تسلیم کرتی ہے۔ انھیں بڑی شکایت ہے کہ ووٹ کی خاطر کانگریس اُردو کے حقوق کو تسلیم کرتی ہے اور اس طرح فرقہ واریت کو ہوا دیتی ہے۔

ہم ان باتوں کا نوٹس نہ لیتے، مگر یش پال ہندی کے چوٹی کے لکھنے والوں میں گنے جاتے ہیں اور اُن کے خیالات سے کچھ لوگ متاثر بھی ہوتے ہیں۔ یش پال کی بنیادی خامی یہ ہے کہ وہ جمہوریت پر اعتقاد نہیں رکھتے۔ اسی وجہ سے اقلیتوں کے معاملے میں اُن کا ذہن صاف نہیں ہے۔ وہ کہنے کو اشتراکی ہیں مگر اُن کے یہاں دہشت پسندوں کی سی فکر ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ وہ زبان کے معاملے میں سب کچھ جانتے ہیں حالانکہ اُن کا علم یہاں بھی بہت محدود ہے۔ وہ جب یہ کہتے ہیں کہ اُردو اور ہندی علیٰحدہ علیٰحدہ زبانیں نہیں، تو یہ بات لسانیات کی رو سے ایک حد تک صحیح ہے، مگر دراصل زیادہ صحیح یہ ہے کہ ہندی بھی علیٰحدہ زبان نہیں۔ ہندی اور اُردو دونوں کھڑی بولی کے ادبی روپ ہیں جو تاریخی حالات کی بنا پر اس طرح جلوہ گر ہوئے ہیں کہ اب انھیں مستقل زبانیں کہا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں اُردو اور ہندی کے فونیموں (Phonemes) میں جو فرق ہے، اُسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور نہ عروض، محاورے، کلاسیکی سرمائے، فکری میلانات کو بالائے طاق رکھا جا سکتا ہے۔ یش پال جی یہ بھلا سکتے ہیں کہ جدید ہندی اُنیسویں صدی کے آغاز سے شروع ہوئی اور اب کھڑی، برج، اودھی سب کے سرمائے کو ہڑپ کرنا چاہتی ہے، لیکن وہ تاریخ کو جھٹلا نہیں سکتے۔ وہ اُردو کے رسم خط کو بدیسی کہتے ہیں۔ لیکن اُن حروف اور آوازوں کو کیا کریں گے جو ناگری رسم خط میں نہیں ہیں اور اُردو رسم خط میں موجود ہیں۔ اور کیا وہ آریوں کو بھی بدیسی کہنے کو تیار ہیں جو اس ملک کے باشندے نہ تھے بلکہ باہر سے آئے تھے اور اپنی ایک بولی بھی لائے تھے۔ اگر پانچ سو سال کے چلن کے بعد بھی ان کے نزدیک کوئی زبان اور رسم خط بدیسی ہے تو ہمیں بدیسی کے مفہوم کو بدلنا ہوگا۔ انھیں انجمن کی تحریک میں فرقہ واریت نظر آتی ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ جسے وہ وطنیت سمجھتے ہیں وہ دراصل فرقہ واریت کا ایک غلاف ہے۔ اُردو صرف مسلمانوں کی زبان نہیں۔ بہت سے مسلمان دوسری علاقائی زبانیں بولتے ہیں، بہت سے غیر مسلم نہ صرف اُردو بولتے ہیں بلکہ اسے اپنی مادری زبان کہتے ہیں۔ سکھ پنجابی کو اپنی زبان سمجھتے ہیں۔ پنجابی کی حفاظت کے لئے اگر سکھ کمربستہ ہوتے ہیں تو اس کی وجہ سے "پنجابی فرقہ واریت" کی علمبردار نہیں ہو جاتی۔ اگر وہ مسلمان جن کی مادری زبان اُردو ہے، اُردو کی حفاظت کے لئے جدوجہد کرتے ہیں تو اُردو مسلمانوں کی زبان کیسے ہو گئی اور اس میں فرقہ واریت کیسے آ گئی۔ آج بھی سندھی عربی رسم خط میں لکھی جاتی ہے تو کیا سندھی بولنے والوں کا ہندوستان پر حق نہیں ہے۔

یش پال کو یہ ناگوار ہے کہ جمہوریت کے حامی اور وطن کے بہی خواہ ہندوستان کی ساری زبانوں کے ساتھ انصاف چاہتے ہیں اور وہ ہندوستان کی ساری تاریخ اور اُس کی مشترک تہذیب سے محبت رکھتے ہیں۔

یش پال "جنانہ" اور اس میں ہندوستان کے سامنے عوام کی رائے کے اظہار کو پسند نہیں کرتے۔ وہ نہیں چاہتے کہ اتر پردیش اور دوسری ریاستوں میں جہاں اُردو بولنے والے

معقول تعداد میں ہیں، سرکاری طور پر اُردو کے حقوق کو تسلیم کیا جائے۔ اسی لئے وہ کانگریس سے بھی ناراض ہیں اور کمیونسٹ پارٹی سے بھی۔ حکمران کو معلوم ہونا چاہئے کہ ہندستان میں جمہوریت روز بروز مستحکم ہو رہی ہے اور اسی لئے اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کا مسئلہ بھی واضح ہوتا جا رہا ہے۔ اب محض دو قومی نظریئے کا نام لے کر، یا اُردو کے رسم خط کو بدیسی کہہ کر، یا اُردو کی حفاظت کی تحریک کو فرقہ وارانہ بتا کر عوام کو گمراہ نہیں کیا جا سکتا۔ گنگا میں پانی کافی بہہ گیا ہے۔

اِدھر اُدھر سے

مقدمہ شعر و شاعری ہندی میں

ساہتیہ اکاڈمی کے زیر اہتمام جن کتابوں کے ترجمے ملک کی دوسری زبانوں میں کئے جا رہے ہیں ان میں مولانا حالی کی کتاب "مقدمہ شعر و شاعری" اور مولانا نذیر احمد کی تصنیف "مراۃ العروس" بھی شامل ہیں۔ "مراۃ العروس" کا ہندی ترجمہ شائع کیا جا چکا ہے اور "مقدمہ شعر و شاعری" کے ترجمے کے مسودے پر نظر ثانی ہو رہی ہے۔ اس کتاب کا مرہٹی زبان میں ترجمہ اشاعت کے لئے تیار ہے۔

علامہ اقبال کی غیر مطبوعہ تصانیف اور خطوط

اقبال اکیڈیمی کراچی نے علامہ اقبال کے ۳۰۳ اصلی خطوط اور پنسل سے لکھی ہوئی ایک اسلامی کتاب کا مسودہ حاصل کر لیا ہے۔ علامہ اقبال نے اس کتاب کو چھپوانے کا ارادہ کیا تھا۔

اس کے علاوہ علامہ کے "ملت" اور "وطن" نامی دو کتابچے بھی اکیڈیمی کو مل گئے ہیں۔ یہ تمام چیزیں غیر مطبوعہ ہیں اور اکیڈیمی ان کی طباعت کا انتظام کر رہی ہے۔

شیکسپیئر سال گرہ کونسل کا قیام

دنیا کے عظیم ڈرامہ نویس اور شاعر شیکسپیئر کی ۴۰۰ ویں سال گرہ ۱۹۶۴ء میں منائی جائے گی۔ اس سے متعلق مختلف سرگرمیوں کو مربوط کرنے کے لئے شیکسپیئر سال گرہ کونسل کا قیام عمل میں لایا گیا ہے۔

کونسل میں ایسے بہت سے لوگوں کو شامل کیا گیا ہے جن کا تعلق شیکسپیری تنظیموں اور اداروں سے ہے۔

ہندی اور اُردو قواعد پر روسی نوجوان کی ریسرچ

روس سے ایک نوجوان ولادیمیر لیبر دوسکی حیدرآباد آئے ہوئے ہیں۔ انھوں نے اورینٹل انسٹی ٹیوٹ ماسکو سے ہندی اور اُردو میں ایم۔ اے کیا ہے اور ان دنوں ہندستان میں اُردو اور ہندی قواعد پر ریسرچ کر رہے ہیں۔

بھوپال میونسپل بورڈ کی طرف سے اُردو اور ہندی شعراء کو انعام

بھوپال میونسپل بورڈ نے اُردو شاعر محمد علی تاج اور ہندی کوی جگدیش گرد کو اُن کے دیوانوں پر پانچ پانچ سو روپے کی رقم بطور انعام دینا منظور کیا ہے۔

اُردو کی قومیت

سنسکرت	اردو	سنسکرت	اردو
منّ	مان نا	ہرن	ہرن
پرچ چھ	پوچھنا	کھن	کھودنا
نو	ناؤ	پل	پل نا
شاکھا	شاخ	چن ڈا	چنڈال
پنجر	پنجرہ	پھل	پھل
جے	جیت نا	مش ٹی	مٹھی
گن	گن نا	دیور	دیور
ون	بن	ننان دِ	نند

(اقبال کرشن)

برطانیہ میں اُردو کی مقبولیت

بریڈ فورڈ۔ ۱۱ مئی۔ برطانیہ کے میونسپل انتخابات میں اُردو زبان سے بھی کام لیا جا رہا ہے۔ لیبر اور قدامت پسند دونوں پارٹیوں نے برطانیہ کے اُردو جاننے والے ووٹروں کی سہولت کے لئے اُردو میں اپنا لٹریچر شائع کیا ہے۔ الیکشن کے سلسلے میں ووٹ دینے کا طریقہ اور ووٹ دینے والوں کے بارے میں مکمل تفصیلات بھی انھوں نے اُردو میں شائع کی ہیں۔

سالار جنگ میوزیم

نئی دہلی۔ ۴ مئی کو لوک سبھا میں ایک بل منظور کیا گیا۔ جس کی رو سے سالار جنگ میوزیم اور سالار جنگ کتب خانے کو حکومت نے قومی اہمیت کا ایک ادارہ قرار دیا ہے۔ یہ بل ایوان اعلیٰ میں پہلے ہی سے منظور ہو چکا تھا اور میوزیم اور کتب خانے کے انتظامات اور دیگر امور متعلقہ کے لئے اس بل میں گنجائش پیدا کر دی گئی ہے۔ بحث میں حصہ لینے والے ممبروں نے اس بل کا گرمجوشی سے خیر مقدم کیا۔ وزیر برائے سائنسی تحقیقات اور ثقافتی معاملات مسٹر ہمایوں کبیر نے بحث کے دوران میں سوالات کے جوابات دیتے ہوئے مرحوم نواب سالار جنگ کو خراج تحسین پیش کیا۔ چونکہ آپ نے قوم و ملک کے لئے ادب کا ایک زریں ذخیرہ چھوڑا ہے۔ مسٹر ہمایوں کبیر نے آگے چل کر کہا کہ میری یہ تمنا ہے کہ جلد از جلد میوزیم کے لئے ایک خاص عمارت تعمیر کی جائے۔

آخر کار

خورشید الاسلام

طاقت جو بال و پر میں تھی، شورش جو آب و گل میں تھی
دیکھا تو آخر فکر کا انداز ہو کر رہ گئی

کاکل کی شب، رُخ کی سحر، جس جس کی تھی دل کو ہوس
سینہ میں گھٹتے گھٹتے اب اک راز ہو کر رہ گئی

جرأت کو تھا پاسِ حیا اور غم کو تھی قدرِ وفا
نس نس بالآخر جسم کی اک ساز ہو کر رہ گئی

ایسی جفا دیکھا گئے، ایسے ستم سہنے پڑے
تیری جفا بھی دعوتِ شیراز ہو کر رہ گئی

آس تراس

شہاب سرمدی

پیڑ تلے پت جھڑ کی مایا
سونا ایسے پات
چیت کے سر سر چھتر تانے
چاندی ایسی رات
سائے اور سناٹے گھومیں
ہاتھ میں دے کر ہات
چپ سادھے پگڈنڈی سوچے
بھولی بسری بات
بھور بھئے کیا جانے کیا ہو؟
کون ہو کس کے سات؟

دھیمی دھیمی ہوا پہ لہرے
بھینی بھینی باس
نیم۔ نواڑی۔ نیبو۔ پھولے
پھولی بن کی گھاس
رات چلی ہے دلہن بن کر
اپنے پیا کے پاس
آس پاس یوں مہکے جیسے
رانی کا رنواس
چاند چڑھے سارا جگ چمکے
سونا کھیت اُداس
سوکھی سرسوں جھن جھن باجے
گونجے سُر کی آس
سو دکھ من کوئی کیا جانے
کاہے ہوت نراس

پذیرائی

وحید اختر

اپنے ہو دیتے شب و روز کی تنہائی سے
میں نے گھبرا کے پکارا تھا کسے کیا معلوم
دستِ تخئیل نے کن زاویوں میں کی شانہ کشی
ذوقِ حبیب نے سنوارا تھا کسے کیا معلوم
خود تراشیدہ بتوں ہی کی عبادت کر کے
ذہن کو رشکِ صنم خانۂ آزر سمجھا
میرے پندار و خود آگہی نے محبت میں بھی
اپنے ہی ساختہ اصنام کو معبود رکھا
میرا شہکار مرے ذہن کے بتخانے سے
جانے کب دزدِ خیالات اُڑا لایا تھا
دستِ فطرت نے اسے حُسن کا پیکر بخشا
ڈھونڈنے بزمِ جہاں میں جسے میں آیا تھا
جا کے ہر کوئے بتاں میں اُسے آوازیں دیں
چاکِ دل، زخمِ جگر، دیدۂ تر دکھلائے
وہ مرا محرمِ پیمانِ ازل مل نہ سکا
ہر نگر میں اُسے ہو دیدہ و دل ڈھونڈھ آئے
اور تھک ہار کے جب آبلہ پا بیٹھ گیا
تیرے قدموں کی صدا پاس سے یوں آئی ہے
میں یہ سمجھا کہ مرے ذہن کی دیواروں سے
اپنی گونجی ہوئی آواز ہی ٹکرائی ہے
آنکھ بھر کر تجھے دیکھا تو ہوا دل کو یقیں
میں نے پوجا ہے خیالوں میں تجھی کو برسوں
تیرے اندازِ تکلم سے ہوا یہ محسوس
گفتگو کی ہے تصور میں تجھی سے پہروں
تو نے سازِ دلِ مضطر پہ رکھا یوں مضراب
عشق نے چھیڑ دئے ہیں نا شنیدہ نغمے
قربِ محتاط کی مانوس حرارت پا کر
کھل گئے شاخِ تمنا پہ ہزاروں غنچے
میری راتوں میں تری یاد کے تاروں کا ہجوم
مہرِ دیدار کی امید سے صبحیں روشن
قرب کی آنچ سے چمکائی ہوئی دوپہریں
شامیں تیرے ہی تصور کے شفق کا دامن
تیری چاہت نے دیا ہے جو گلاب تازہ
دل کے گلدستۂ رنگیں میں سجا رکھا ہے
مئے امید سے لبریز ہے اُمید کا جام
گردِ اندیشہ سے دامن کو بچا رکھا ہے
تو اگر چاہے تو وہ خواب حقیقت بن جائیں
میں نے اب تک جنھیں آنکھوں میں چھپا رکھا ہے

مراسلات

دیسنہ لائبریری مرحوم

۲۲؍اپریل کے "ہماری زبان" میں سید شہاب الدین دسنوی صاحب نے جو مضمون "دیسنہ لائبریری مرحوم" کے عنوان سے سپرد قلم فرمایا ہے میری نظر سے گذرا۔ افسوس کہ اس مضمون میں سید عبدالنعیم صاحب دسنوی ڈسٹرکٹ سب رجسٹرار کا کوئی ذکر نہیں ہے مرحوم ہماری بستی کے اولین گریجوایٹ (گولڈ میڈلسٹ) اور لائبریری کے بانیوں میں تھے۔ وہ سید عبدالحکیم صاحب کے برادر خورد نہایت نیک نفس، مرنجان مرنج، بڑے ہی دیانتدار اور دین دار بزرگ تھے۔ ساری زندگی موصوف نے اکل حلال پر بسر کی۔ مرحوم نے لائبریری کو کئی قیمتی کتابیں مثل فرہنگ آصفیہ، تمدن عرب اور قدیم علی گڑھ منتھلی اور رسالہ معارف علی گڑھ و پانی پت کے سٹ عنایت کئے تھے۔ لائبریری کے بڑھانے اور ترقی دینے میں مرحوم زندگی بھر کوشاں رہے۔ دوسری قابل ذکر ہستی ہم لوگوں کے بزرگ محترم جناب مولوی محمد صدیق صاحب مختار مرحوم کی تھی جن کی ذات سے لائبریری کو ہمیشہ مستفید ہونے کا موقع نصیب ہوتا رہا۔ مرحوم پُرانی عربی و فارسی تعلیم کے آدمی تھے۔ مگر سرسید۔ نواب محسن الملک۔ نواب وقار الملک۔ جسٹس سید محمود نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی اور میر ولایت حسین کی آنکھیں دیکھے ہوئے بہت ہی روشن خیال بزرگ تھے۔ اپنی کوشش سے موصوف نے انگریزی بھی سیکھ لی تھی۔ قدیم محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میں کئی سال شریک بھی ہوئے تھے۔ لائبریری کے ساتھ برابر آپکی نوازش کریمانہ رہی اور بستی کے نوجوان طبقہ کی آپ نے برابر ہمت افزائی اور رہنمائی فرمائی۔ لائبریری بلڈنگ کی تعمیر میں بھی آپکے بڑی مدد کی تھی۔ کتابیں بھی اکثر لائبریری کی نذر کیا کرتے تھے۔ دسنہ سے سب سے پہلے آپ ہی نے اپنے بھتیجے ڈاکٹر احمد کریم کو ۱۸۹۶ء میں تعلیم کے لئے علی گڑھ بھیجا تھا اور اس کے ساتھ اپنے بڑے صاحبزادہ مظفر امام محمد وحید کو ایف۔ اے سے بی۔ اے تک علی گڑھ کالج میں تعلیم دلوائی تھی۔ وحید مرحوم بہار گورنمنٹ کی اگزیکیوٹو (EXECUTIVE) سروس میں ڈپٹی مجسٹریٹ تھے۔ ولایت علی مرحوم بھوق کے ساتھی اور گہرے دوست تھے۔ افسوس کہ جواں مرگی کے سبب وہ لائبریری کی کوئی قابل قدر خدمت انجام نہیں دے سکے۔

ڈاکٹر احمد کریم مرحوم نے بھی لائبریری کی بڑی خدمت کی تھی۔ بہت سی کتابیں اور فرنیچر ڈاکٹر صاحب ہی کی نوازش سے لائبریری کو ملے تھے۔

علامہ ڈاکٹر سید سلیمان ندوی مرحوم کا ذکر خیر تو مضمون مذکورہ بالا میں آگیا ہے مگر وہ بہت تشنہ ہے۔ علامہ ندوی کی قابل قدر خدمت جو لائبریری کے حصے میں آئی اس کا کوئی تذکرہ مضمون میں نہیں ہے۔ ابتدائے اشاعت ۱۹۱۶ء سے ۱۹۴۶ء تک لائبریری کو رسالۂ معارف اور کُل مطبوعات دار المصنفین بلاقیمت موصوف ہی کی مہربانی سے حاصل ہوتی رہیں۔ اس کے علاوہ بھی سید صاحبؒ برابر اچھی اچھی کتابیں جو ان کے پاس بطور ہدیہ آتی تھیں لائبریری کو عنایت فرماتے رہتے تھے۔ "خطباتِ مدراس" کے پہلے ایڈیشن کی سیکڑوں جلدیں علامہؒ نے لائبریری کو عنایت کی تھیں جن کی فروخت سے لائبریری مستفیض ہوئی تھی۔ بڑی ناانصافی ہوگی اگر سید صاحبؒ کے تربیت یافتہ مولوی سید صباح الدین عبدالرحمن ایم۔ اے دسنوی کا اس جگہ ذکر نہ کیا جائے۔ زمانۂ طالب علمی میں وہ برابر اپنے خالہ زاد بھائیوں سید محمد نسیم اور ڈاکٹر سید محمد شمیم کے دوش بدوش لائبریری کی ترقی میں کام کرتے رہے اور جب سے وہ رفیق دار المصنفین ہیں لائبریری کے سرپرستوں اور خدمت گذاروں میں اُن کا شمار رہا ہے وہ اپنی تصنیفات اور دوسری کتابیں بھی لائبریری کو برابر عنایت فرماتے رہتے ہیں۔

(محمد بشیر الحق دسنوی عظیم آبادی)

سبع سیارہ

"ہماری زبان" کا شمارہ مورخہ ۸ر اپریل ۱۹۷۶ء جس میں حضرت ناطق گلاوٹھوی کی کتاب "سبع سیارہ" پر ضیاء احمد صاحب بدایونی نے تبصرہ کیا ہے، میں نے ناطق صاحب کی خدمت میں پیش کیا۔ موصوف پیرانہ سالی کے سبب لکھنے پڑھنے سے معذور ہیں اس تبصرے کو سُننے کے بعد جو کچھ فرمایا وہ لکھتا ہوں:

عمر خیام کی رباعیات کے سلسلے میں ضیاء احمد صاحب کو بھی اعتراف ہے کہ بہت سی الحاقی رباعیات اس سے منسوب کردی گئی ہیں۔ تبصرہ نگار صاحب کو بتانا چاہیئے کہ وہ کون سی رباعیات ہیں اور ان میں سے کتنی متقدمین شعرائے فارسی کی ہیں اور کتنی متاخرین کی۔ میرا تو خیال ہے کہ وہ سب رباعیات متقدمین کی ہیں جن میں سنائی وغیرہ شامل ہیں۔ متاخرین میں شاید کسی ایک کی بھی نہ ہو۔ جب یہ بات ہے تو پھر ہم یہ فیصلہ کیوں نہ کریں کہ وہ سب رباعیاں بجائے الحاقی ہونے کے عمر خیام کی ہی جمع کی ہوئی ہیں خود عمر خیام کی نہیں ہیں۔

"سبع سیارہ" کے سلسلے میں ناطق صاحب پر خود ستائی اور دوسروں کی تنقیص کا جو الزام لگایا گیا ہے اس سلسلے میں موصوف نے فرمایا کہ یہ بات مستقل مضامین میں نہیں بلکہ خطوط میں ہے جو اس کتاب میں شامل کردئے گئے ہیں۔ نجی خطوط میں انسان کیا کچھ نہیں لکھ دیتا۔

حالی کی "مدوجزر اسلام" کے بارے میں ناطق صاحب کا کہنا یہ ہے کہ "میں نے جو کچھ لکھا ہے اس کے ثبوت میں تو اب

وقار الملک کا ارشاد موجود ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس سے بڑا اور کون سا ثبوت ضیاء صاحب کو درکار ہے۔ میں نے یہ بھی نہیں لکھا ہے کہ وہ تصنیف مولانا حالی کی نہیں۔ یہ لکھا ہے کہ سرسید علیہ الرحمہ حالی صاحب کے لکھے ہوئے کو بار بار بدلواتے تھے اور بالآخر جو لکھا ہوا ہوتا تھا وہ حالی صاحب کا ہی ہوتا تھا۔

مولانا ناطق صاحب نے آخر میں فرمایا کہ "البتہ مجھے اس خط کی اشاعت پر افسوس ہے جو "شہ پارے" کے عنوان سے شامل کتاب ہو گیا۔ یہ خط بیس سال پہلے رسالہ کارواں میں شائع ہوا تھا جسے میں نے اپنے بچپن کے رفیق حضرت مولانا کمالی جمشید پوری کو مزاحاً لکھا تھا۔ اس خط میں ضرور رکاکت آگئی ہے جس پر مجھے کتاب میں اشاعت کے وقت خیال کر لینا تھا لیکن بے خیالی میں وہ شامل ہو گیا۔ (محمد حنیف فاتح۔ ناگپور)

"عمر خیام اور مسیح تیارہ" کے سلسلے میں بحث اب ختم کی جاتی ہے (ادارہ)

عمر خیام شاعر نہ تھا؟

گذشتہ ۱۵ مارچ کے شمارے میں حضرت ناطق صاحب گلاؤٹھوی نے عمر خیام کے شاعر ہونے کا ثبوت مانگا ہے ان کا یہ دعویٰ ہے کہ عمر خیام نے شاعری کی ہی نہیں، وہ تو ایک بڑا عالم معقولات تھا۔ اور نہ ہی ان کی تصنیف کی ہوئی کوئی کتاب ملی۔ انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ جو رباعیاں ان کے نام سے مشہور ہیں اصل میں متقدمین ہی کی ہیں، جنھیں وہ اپنی ایک خاص بیاض میں جمع کرتا رہا اور بعد میں یہ بیاض اسی کے نام سے مشہور ہو گئی۔

الجواب: شاطر۔ اکل کنواں ـــ ایک حد تک حضرت ناطق صاحب کا یہ دعویٰ صحیح ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے ان کی کوئی تصنیف کی ہوئی کتاب نہ ملے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ جو رباعیاں ان کے نام سے مشہور ہیں دوسروں کی ہوں۔ ہو سکتا ہے جناب عبدالحمید عدم پاکستانی عمر خیام آج تک مغالطہ میں ہوں۔ جناب ناطق صاحب کا یہ دعویٰ اس وقت صحیح ہو سکتا ہے جب عمر خیام کی کوئی تصنیف کی ہوئی کتاب نہ ملے۔ ناطق صاحب نے فرما دیا ہے کہ عمر خیام ایک بہت بڑا عالم معقولات تھا۔ اسے جتنی بھی رباعیاں پسند آئیں اور اس نے جتنی بھی پسند کیں رباعیاں جمع کیں آج انھیں اٹھا کر دیکھا جائے تو تین چوتھائی حصہ شیشہ اور شراب کے ذکر سے معمور ہے۔ کیا ایک عالم اس چیز کو پسند کر سکتا ہے۔ اس وقت عمر خیام کی چند رباعیاں درج کی جاتی ہیں جن کا ترجمہ جناب عبدالحمید عدم پاکستانی نے کیا ہے ان میں تخلص استعمال ہوا ہے۔

جناب ناطق صاحب اپنا مغالطہ دور کر لیں یا ہماری غلط فہمی دور کر دیں۔ ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ حضرت ناطق صاحب کا آخر دعا کیا ہے۔ اگر واقعی عمر خیام ایک بہت بڑا عالم معقولات تھا تو پھر ہمیں اسے عالم دین کہنا چاہئے کیونکہ بقول ناطق صاحب وہ شاعر نہیں تھا۔

تا بتوانی خدمت رنداں مے کن ● بنیاد نماز و روزہ ویراں مے کن
بشنو سخن راست ز خیام عمرؔ ● مے مے خور و رہ مے زن و احساں مے کن

خیام کہ خیمہ ہائے حکمت می دوخت ● در کورۂ غم فتاد و ناگاہ بسوخت
مقراض اجل طناب عمرش ببرید ● دلال قضا برائیگانش بفروخت

(ترجمہ ۲)

خیام۔ جو کہ سیتا تھا خیمے رموز کے ● اک روز غم کی آگ سے ناگاہ جل گیا
کاٹی طناب عمر اس کی حیات نے ● دلال موت مفت میں اس کو نگل گیا

خیام اگر بادہ پرستی خوش باش ● با سادہ رخے اگر نشستی خوش باش
چوں عاقبت کار جہاں نیستی است ● انگار کہ نیستی چو ہستی خوش باش

(ترجمہ ۳)

یار۔ خیام! اگر شرابی ہے ہمدم چہرۂ کتابی ہے
زندگی ہی نہیں تری سرخوش عافیت بھی تری گلابی ہے

ہر رباعی میں عمر خیام کا مقطع موضوع ہو سکتا ہے لفظی معنی سے اگر مضمون کا تعلق بھی رہے پھر بھی یار! جب کہا ہے تو یقینی بات ہے کہ اشارہ ایک شاعر کی طرف ہو سکتا ہے۔ ناطق صاحب سے ہماری درخواست ہے کہ ظاہری چیز کو باطن میں کبھی تبدیل نہ کریں۔ اسلام ظاہر دیکھتا ہے نہ کہ باطن۔ مجھے پوری امید ہے کہ حضرت ناطق صاحب شمس تبریز۔ حضرت منصور وغیرہ کی سوانح حیات کو مد نظر رکھتے ہوئے "ہماری زبان" کے اگلے شمارہ میں ضرور اس کا جواب عطا فرمائیں گے۔

(شاطر۔ اکل کنواں۔ صدر انجمن ترقی اردو شاخ مہاراشٹر)

اُردو ادیب اور صوبائی حکومتیں

حکومتوں کے قوانین یکساں ہیں۔ ہر صوبے میں اُس کی علاقائی زبان کے لئے الگ الگ رقمیں منظور ہوتی ہیں۔ بہار، بنگال، اڑیسہ، راجستھان، دہلی، پنجاب، مہاراشٹر، گجرات، مدراس، مدھیہ پردیش۔ غرض کوئی صوبہ ایسا نہیں جہاں اُردو کے اچھے ادیب و شاعر نہ ہوں جہاں کتابیں نہ چھپتی ہوں تو پھر ان صوبوں میں اُردو کے مصنفین اور اُنکی تصانیف کو کیوں نظر انداز کیا جا رہا ہے؟

حال ہی میں اطلاع آئی ہے کہ حکومت پنجاب نے پہلی بار اُردو کی ایک تصنیف پر گیارہ سو روپیہ کی رقم دی ہے اور یہ تصنیف حضرت جوش ملسیانی کی ہے؟ علی ہذا القیاس مہاراشٹر سرکار نے صرف ایک بار قیصر امراؤتی کے شعری مجموعہ پر ایک ہزار روپیہ انعام دیا۔ لہٰذا یو۔ پی، آندھرا پردیش کے علاوہ انجمن ترقی اردو مرکز اپیل کرتی ہے اور اس بات پر زور دیتی ہے کہ ساہتیہ اکاڈیمی کی طرف سے اسکو بھی اُردو کی نمائندگی حاصل ہو اور اس سلسلے میں معاونت فرمائے۔ (اللہ بخش نشتر)

انجمن کا خبر نامہ

اردو کے متعلق حکومت کی پالیسی پر عمل درآمد کے لئے کمیٹی

وزیر اعلیٰ شری چندر بھان گپتا اسلامیہ کتب خانہ ۔ دیکھنے گئے جہاں منتظمین نے ان کا استقبال کیا۔ انھوں نے وزیٹرس رجسٹر میں اردو میں دستخط کئے۔

... میں ایک عام جلسہ کو مخاطب کرتے ہوئے شری گپتا نے کہا کہ اردو ہمارے صوبہ میں بہت سی جگہوں میں بولی جاتی ہے جہاں تک بولنے کا سوال ہے اردو اور ہندی میں کوئی فرق نہیں ہے۔ فرق تو اس وقت ہو جاتا ہے جب ان میں فارسی اور سنسکرت کے الفاظ ٹھونس دئے جاتے ہیں۔

انھوں نے کہا کہ زبان کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے خواہ وہ کوئی زبان ہو۔ ہندی اور اردو کا آپس میں مقابلے کا کوئی سوال ہی نہیں ہے ہندی کو ہم قومی زبان تسلیم کر چکے ہیں اور جہاں تک اردو کا سوال ہے اس کی ترقی اور نشو و نما کے لئے صوبائی حکومت کوشاں ہے وہ اس سلسلے میں ایک کمیٹی مقرر کرنے جا رہی ہے جو اس بات کی رپورٹ دے گی کہ وہ کونسی رکاوٹیں ہیں جو اردو کے بارے میں حکومت کی پالیسی کو عملی جامہ پہنانے میں حائل ہیں۔

شری گپتا نے کہا کہ ہندو یہ سمجھیں کہ وہ اکثریت میں ہیں تو غلبہ کی کوئی وقعت ہی نہیں ہے۔ اگر وہ ایسا سوچتے ہیں تو یہ ان کی تنگ نظری ہے۔ دوسری طرف اگر مسلمان بھی یہاں رہ کر کسی دوسرے ملک کی طرف دیکھتے ہیں تو یہ ان کی غلطی اور خام خیالی ہے۔

کتب خانہ کی طرف سے پیش کئے گئے سپاسنامہ کا جواب دیتے ہوئے انھوں نے عوام اور منتظمین کتب خانہ کا اپنے استقبال کے لئے شکریہ ادا کیا۔ انھوں نے وعدہ کیا کہ وہ کتب خانہ کے لئے ہر ممکن امداد کو تیار ہیں۔

وزیر اعلیٰ شری چندر بھان گپتا نے سرکٹ ہاؤس میں ایک پریس کانفرنس میں ہمارے نمائندہ شری کاظم رضوی کو ایک سوال کے جواب میں بتایا کہ حکومت اردو کو اس کا جائز مقام دلانے میں پوری کوشش کر رہی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس سلسلے میں ایک کمیٹی مقرر کی گئی ہے جو یہ دیکھے گی کہ کہاں پر اردو کے ساتھ بے انصافی کی جا رہی ہے۔ نمائندے نے پوچھا کہ کمیٹی اپنی رپورٹ کب تک دے گی۔ اس کے جواب میں انھوں نے کہا کہ "امید ہے کہ یہ کمیٹی اپنی رپورٹ مئی کے آخر تک ضرور دے دے گی۔" (قومی آواز)

اردو رسم خط میں امتحان دینے والوں کے لئے پھر ایک سنگین مسئلہ

پٹنہ۔ ۵ مئی۔ یونیورسٹی ذرائع سے یہ خبر ملی ہے کہ خلاف دستور اس سال آئی اے، بی اے، آئی کام، بی آئی ایس سی، بی ایس سی کی وہ کاپیاں بھی جو اردو رسم خط میں ہیں ایسے ممتحنوں کے پاس عام طور سے بھیجی جا رہی ہیں جو مطلق اردو نہیں جانتے۔ ان لڑکوں کے لئے جنھوں نے قواعد کی رو سے اپنی مادری زبان اردو میں امتحان کے پرچے لکھے ہیں یہ ایک نیا اور سنگین مسئلہ کھڑا کر دیا گیا ہے۔ ہر سال ان مضامین کے اردو داں اساتذہ کے پاس ایسی کاپیاں بھیجی جاتی تھیں بعض حلقوں کا کہنا ہے کہ اردو داں اساتذہ کا کافی تعداد میں اکزامنر ہونا یونیورسٹی کے کچھ صاحبان اقتدار کو کھل گیا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ رسم خط کی مطابقت سے کاپیاں بھیجنے پر امتحان دینے والوں کے ساتھ انصاف ہوا کرتا تھا اور پچھلے چند برسوں میں چند ایک اردو طلبہ نے بھی اچھا ریزلٹ کیا تھا۔ یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد میں سے کچھ لوگ اسے پسندیدگی کی نظروں سے نہ دیکھ سکے۔ معلوم ہوا ہے کہ ان دنوں کئی اکزامنر ادھر ادھر اردو داں ٹیچروں، طلبہ اور پروفیسروں سے یہ کاپیاں پڑھواتے چلتے ہیں اور بے تکے نمبر بٹھاتے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس طرح اردو داں طلبہ کا نتیجہ خراب ہوگا۔ (ہفت روزہ "سنگم")

انجمن ترقی اردو مراد آباد

۵ اپریل کو رات کے ۹ بجے مولانا عروج اریب صاحب کی صدارت میں انجمن ترقی اردو مراد آباد کی ... آفس میں ادبی نشست منعقد ہوئی۔ مولانا حاتم علی صاحب، رئیس صاحب امروہوی، مولانا معتقد علی صاحب، حاجی کلن صاحب، عثمان احمد صاحب صاحب وکیل، بھگوت سرن صاحب، تنزیل الرحمٰن صاحب نیز دیگر معززین نے شرکت کی۔ فروری کے مہینے میں مردم شماری کے سلسلے میں جو اردو ہفتہ منایا گیا تھا اس کی پوری روداد حاضرین کے سامنے پیش کی گئی جس پر حاضرین نے اظہار مسرت کیا۔ چند ضروری تجاویز پاس ہوئیں۔

اس کے بعد رئیس صاحب امروہوی، دلکش صاحب فریدی، اختر وارثی صاحب لکھنوی، جوہر صاحب سہنس پوری، حسرت صاحب، جلال صاحب، مسرت صاحب، محبوب صاحب، تنزیل الرحمٰن صاحب شیدا، بھگوت سرن صاحب، ممتاز نواز صاحب، حاجی رشید صاحب، سالک صاحب نیز شعرائے کرام نے اپنے کلام سے حاضرین کو مستفیض کیا۔

اُردو کی حمایت قوم پرور ہندوؤں کا فرض

لکھنؤ۔ ۱۱ مئی۔ کونسل میں مسٹر شفیق احمد خاں تاتاری کی اس غیر سرکاری تجویز پر مباحثہ جاری رہا جس میں ہائی کورٹ کا سب کام ہندی میں کئے جانے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ مسٹر چیمبر پرکاش (جن سنگھ) نے بل کی تائید کرتے ہوئے ہندی کو سنسکرت کی ترقی کے لئے ضروری قرار دیا۔

انھوں نے مختلف ماہرین تعلیم۔ انگریز حکمرانوں اور مسلم لیگی رہنماؤں خاص کر مفتی فخرالاسلام کی تقریریں پڑھ کر سنائیں جن میں امید ظاہر کی گئی تھی کہ "ہندوستان کی زبان ایک دن سنسکرت ہوگی۔

مولانا شاہد فاخری (کانگریس) نے بل پر تقریر کرتے ہوئے مطالبہ کیا کہ ہندی کی ترقی کے ساتھ اُردو کی ترقی بھی ضروری ہے۔

مسٹر شیو نرائن (کانگریس) نے بل پر اظہار خیال کرتے ہوئے مسٹر چیمبر داس کی تقریر پر تعجب کا اظہار کیا۔ انھوں نے حیرت ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ سنسکرت کیونکر ہندوستان کی زبان ہو سکتی ہے۔ انھوں نے مولانا شاہد فاخری کو جواب دیتے ہوئے کہا کہ اُردو ہندو مسلمانوں کا مشترکہ سرمایہ اور قابل فخر میراث ہے۔ اُردو کی حمایت کرنا ہر قوم پرور ہندو کا فریضہ ہے۔　(الجمعیۃ دہلی)

بھینسہ میں اُردو کی گیارھویں اور چھٹی جماعت کے قیام کا مطالبہ

عادل آباد۔ ۱۱ مئی۔ انجمن ترقی اُردو بھینسہ ضلع عادل آباد کے سکریٹری مسٹر محی الدین قریشی نے گورنر آندھرا پردیش سے درخواست کی ہے کہ بھینسہ میں گیارھویں جماعت اور اُردو کی ساتویں جماعت کا کسی شرط کے بغیر آغاز کیا جائے۔ سکریٹری نے اپنی ایک یادداشت میں جس کی نقلیں وزیر تعلیمات، ناظم تعلیمات و معتمد انجمن ترقی اُردو حمایت نگر کو بھی دی گئی ہیں کہا ہے کہ بھینسہ کے عوام کی درخواست پر ناظم تعلیمات نے بھینسہ میں اُردو کی ساتویں جماعت کے آغاز کا حکم دیدیا اور اس کارروائی کو ضلع پریشد عادل آباد کے حوالے کر دیا لیکن ضلع پریشد نے اس شرط پر ان جماعتوں کے قیام کی اجازت دی کہ ان جماعتوں کے قیام کے لئے عوام بھی چندہ دیں حالانکہ مرکزی حکومت نے جو پالیسی مرتب کی ہے یہ شرط اس کے عین خلاف ہے۔ سکریٹری نے مزید بتایا ہے کہ اس سال (۱۹) میں سے (۱۲) لڑکوں نے دسویں جماعت میں کامیابی حاصل کرلی۔ اس کے علاوہ (۳۰) میں سے (۲۸) لڑکیوں نے اُردو کی چھٹی جماعت میں کامیابی حاصل کرلی ہے۔ ان لڑکوں اور لڑکیوں کو مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے اب یہاں کوئی سہولت حاصل نہیں۔ اس طرح انھیں مجبوراً تعلیم کو ترک کرنا پڑ رہا ہے۔ سکریٹری نے گورنر سے درخواست کی ہے کہ بھینسہ میں اُردو کی ۱۱ ویں اور اسی طرح لڑکیوں کے لئے اردو کی ساتویں جماعت کے غیر مشروط قیام کی ہدایت کی جائے تاکہ ان طلبہ اور طالبات کو حصول تعلیم میں مایوسی نہ ہو۔　(سیاست حیدرآباد)

ماہنامہ "تحریک" کا "غالب نمبر"

ماہنامہ تحریک دہلی کا غالب نمبر شائع ہو گیا ہے۔ اس خاص نمبر میں غالب کی شخصیت اور فکر و فن پر مضامین، ان کے کلام کا انتخاب اور غالب سے متعلق اہم تحقیقی اور تنقیدی تحریروں کے اقتباسات شامل ہیں۔

اس کی ضخامت ۱۲۰ صفحے اور قیمت ایک روپیہ ہے۔ اور یہ منیجر ماہنامہ "تحریک" ۹ انصاری مارکیٹ دریا گنج۔ دہلی ۶ سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

انجمن تعمیر اُردو دلّی کے زیر اہتمام یوم ٹیگور

انجمن تعمیر اُردو دلّی کے زیر اہتمام یوم ٹیگور اتوار ۷ مئی کو شام کے چھ بجے اردو ہال اُردو بازار دلّی میں منایا گیا۔

جلسہ کی صدارت مشہور صحافی اور شاعر حضرت دیپک ایم ریڈی مدیر جنگ و شیرازہ نے کی اور مولانا حفظ الرحمٰن نے جلسہ کا افتتاح کیا۔

جلسے میں دلّی کے اہم ادیب، شاعر، صحافی اور اساتذہ شریک ہوئے۔ گلزار دہلوی جنرل سکریٹری انجمن تعمیر اُردو نے رئیس امروہوی کا خیر مقدم کیا۔

ٹیگور کی شخصیت اور شاعری پر مولانا حفظ الرحمٰن ایم پی کی افتتاحی تقریر کے علاوہ نورالدین احمد بیرسٹر۔ ڈاکٹر قمر رئیس، دیوان ظفر بیامی، شری جیمنی راج رتن، مولانا عزیز الرحمٰن لدھیانوی اور گلزار دہلوی نے تقریریں کیں اور مقالات پڑھے زیش کمار شاد، مخمور سعیدی، ذاکٹ دہلوی، عزیز وارثی، پریم سنگھ فرحت، شری کیشپ جی اور گلزار دہلوی نے ٹیگور کو منظوم خراج پیش کیا۔ ایسٹ ایڈ، آئکر منو سیر بہائے انوذ، جناب جگن ناتھ آزاد، پروفیسر غلام احمد فرقت کاکوروی نے اپنا کلام سنایا۔ بعد ازاں صدر جلسہ رئیس امروہوی نے مختصر تقریر کی اور اپنے قطعات، نظمیں اور غزلیں سنائیں۔

(عزیز وارثی۔ جوائنٹ سکریٹری)

شاعر اعظم ٹیگور کا صد سالہ جشن

دارالمطالعہ و کتب خانہ عام (انجمن ترقی اُردو) مغل پورہ کے زیر اہتمام شاعر اعظم رابندر ناتھ ٹیگور کی صد سالہ سالگرہ کی تقریب بڑے پیمانے پر منائی گئی۔ اس موقع پر ایک جلسہ کو مخاطب کرتے ہوئے رکن بلدیہ جہاندار افسر نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ ہندوستان کی مردم خیز سرزمین نے گوتم سے گاندھی اور نانک سے نہرو تک کئی عظیم شخصیتوں کو جنم دیا۔ جنھوں نے اپنے اپنے دور میں دنیا کے سامنے صلح، امن اور محبت کا فلسفہ پیش کیا۔ ٹیگور بھی انھیں شخصیتوں میں سے ایک ممتاز مقام کے مالک تھے۔ انھوں نے دنیا کو اپنی پینٹنگ، شاعری، کہانیوں اور موسیقی کے ذریعہ عالمی اخوت، رواداری اور امن و اتحاد کا عالمگیر پیغام دیا۔ قبل ازیں معتمد ادارہ بشیر انور نے بھی اپنی تقریر میں شاعر اعظم کو خراج تحسین پیش کیا۔　(نامہ نگار)

سوال و جواب

(تفصیل کے لئے ۸ مئی ۱۹۶۱ء کا ہماری زبان دیکھئے ۔ ادارہ)

اُردو کا پہلا ڈرامہ نگار ——— فرخ جلالی

۸ مئی سنہ ۱۹۶۱ء کے "ہماری زبان" میں محترمہ جہاں بانو نقوی نے پوچھا ہے: "کیا یہ صحیح ہے کہ امانت لکھنوی پہلا شخص ہے جس نے اُردو میں ڈرامہ لکھا؟ یا واجد علی شاہ کو اولیت حاصل ہے؟"
پہلے سوال کا جواب اس وقت تک قطعی تحقیق نہیں ہے۔ ڈاکٹر عبد العلیم نامی صاحب نے گوپی چند و جالندھر کے مصنف کو پہلا ڈرامہ نگار مانا ہے مگر وہ ڈرامہ نہیں مل سکا۔ نواز کے ترجمہ شکنتلا کا ذکر بھی کیا جاتا ہے۔ وہ بھی میں نے نہیں دیکھا۔ برٹش میوزیم لندن میں ریو کی فارسی مخطوطات کی فہرست میں مختلف کتابوں کی ایک بیاض نمبر ۲۰۱۶ OR ہے اس میں سنسکرت کے ایک ڈرامہ نگار کرشن داس مصر کے ایک ناٹک کا فارسی ترجمہ ہے سنہ ۱۰۶۳ھ میں بنوالی نے بھوانی داس کی مدد سے اس کو گوالیاری یا بھاکا سے ترجمہ کیا۔ گمان ہے کہ یہ شمالی ہند میں اُردو کی ابتدائی شکل کا ایک نمونہ ہوگا۔ اس کے علاوہ اٹھارویں صدی کے اواخر میں ایک روسی سیاح لیبیدوف ہندوستان آیا۔ اس نے کلکتہ میں رہ کر بنگالی اور اُردو سیکھی اور اس نے سنہ ۱۸۰۱ء میں اُردو گرامر بھی شائع کی۔ وہ مذکورہ کتاب میں ہندوستانی زبان کا ایک اسٹیج تیار کرنے کا ذکر بھی کرتا ہے۔ قطعی سواد کے میری دسترس میں نہ ہونے کی صورت میں میری رائے میں اندر سبھا امانت اُردو کا پہلا موجود ڈرامہ ہے۔

سوال کا دوسرا حصہ کہ "کیا واجد علی شاہ کو اولیت حاصل ہے" توجہ کے قابل ہے۔ میری رائے میں واجد علی شاہ کو اولیت حاصل نہیں ہے۔ یہ رائے محترم سید مسعود حسن رضوی ادیب کی ہے کہ "اس اہم صنف ادب کی بنیاد ڈالنے کا فخر ان (واجد علی شاہ) کے لئے اُٹھ رہا تھا" "لکھنؤ کا شاہی اسٹیج" کے پیش نامہ میں محترم رضوی صاحب لکھتے ہیں:-

"یہ ڈراما رادھا کنہیا کا قصہ کے نام سے واجد علی شاہ نے اپنی ولیعہدی کے زمانے میں سنہ ۱۲۵۹ ہجری اور سنہ ۱۲۶۳ھ کے درمیان لکھا تھا اور بعد میں اپنی کتاب "بنی" میں شامل کر دیا جو ۱۲۹۳ھ کی تصنیف ہے" صفحہ ۲۱۰

تصحیح

"ہماری زبان" ۸ مئی سنہ ۱۹۶۱ء کے صفحہ ۲ پر اسیر مینائی کے قصیدے کے عنوان میں 'قیصر شاں' کے بجائے 'فیض رساں' پڑھئے۔

مگر اسی کتاب کے صفحہ ۹۹ پر محترم رضوی صاحب کو اس ڈرامے کے تعین زمانہ پر شک ہو چکا ہے۔ فرماتے ہیں:-
"واجد علی شاہ کا تصنیف کیا ہوا رادھا کنہیا کا ایک قصہ اب تک موجود ہے۔ قیاس کہتا ہے کہ یہ وہ قصہ یا ناٹک تھا جو لکھنؤ کے شاہی محل میں پہلے پہل کھیلا گیا۔"
واجد علی شاہ خود مذکورہ کتاب "بنی" (بمعنی عروس) میں کہیں یہ نہیں لکھتے کہ یہ رہس سنہ ۱۲۶۲ ہجری یا زمانہ ولیعہدی میں لکھا گیا۔ اصل میں یہ کتاب "بنی" کلکتہ میں لکھی گئی اور مٹیا برج مطبع سلطانی میں رئیس الدولہ کے اہتمام سے سنہ ۱۲۹۴ ہجری میں چھپی۔ واجد علی شاہ اس کتاب "بنی" کے شروع میں لکھتے ہیں:-
"ما قبل اس کے دو کتابیں ناجو اور دُلہن تقسیم ہو چکیں مگر اس کا رنگ نیا ہے جو نقل اور قصہ ہے۔ ایک تازہ گل کھلا ہے بال کی کھال کھینچی ہے ہندی کی چندی کی ہے انصاف طباعوں کے ہاتھ ہے میرا تو بنگالیوں کا ساتھ ہے۔ مقفی اور مسجع عبارت کا خیال نہیں کیا مگر کسی مطلب کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا بلکہ اسی لحاظ سے ترک منظور ہوا کہ مطلب نہ جائے۔"
یہ رنگ بھی صرف دیباچہ میں ہے پھر بھی محترم رضوی صاحب ایک نئی بات کہتے ہیں۔
"بنی میں رادھا کنہیا کا ایک دوسرا قصہ بھی ہے۔ اس کتاب کی تصنیف کے وقت واجد علی شاہ کو کلکتہ میں رہتے ہوئے بیس برس ہو چکے تھے معلوم نہیں یہ دوسرا قصہ انھوں نے لکھنؤ میں لکھا یا کلکتے میں۔" (لکھنؤ کا شاہی اسٹیج صفحہ ۲۱۰)
لیکن واجد علی شاہ اس کے برعکس 'بنی' میں صفحہ ۱۲۳ پر لکھتے ہیں:-
"الحمد للہ کہ تا سنہ ۱۲۹۳ھ مقام کلکتہ محلہ مٹیا برج میں یہ دونوں قصے الگ الگ مع چھتیس رہسوں کے تیار اور مرتب ہیں۔"
واجد علی شاہ دونوں کو قیام کلکتہ کی تصنیف بتاتے ہیں اور محترم رضوی صاحب سنہ ۱۲۶۲ ہجری خیال فرماتے ہیں اس کی ہدایات میں گھونگٹ بنگالہ کا ذکر آیا ہے۔ رادھا کنہیا کی زبان ہدایات سب بتا رہے ہیں کہ یہ کلکتہ میں لکھا گیا۔
محمد حسین ادیب نے اُردو ڈراما پر کام کیا ہے اور ۲۷ جون سنہ ۱۹۳۲ء کو اس رہس کو ریڈیو پر پیش کر چکے ہیں وہ کہیں یہ نہیں کہتے کہ یہ اُردو کا پہلا ڈراما ہے۔ محترم رضوی صاحب نے ان کا ذکر بھی اپنی کتاب میں نہیں کیا ہے۔

بقیہ
مصحفی کا جمالیاتی شعور

جس شاہکار میں فن کار اپنے ادراک کی مسرت انگیز اور اثباتی کیفیت کا کامیابی سے اظہار کر سکے یقیناً وہ شاہکار ہے۔ اسی طرح فنکار کی جو تخلیق جمالی حس کی غم آمیز اور سلبی حالت کی پردہ کشائی کرے وہ ایک قابل قدر تخلیق کہے جانے کی مستحق ہے مگر جہاں یہ دونوں حقیقتیں جمع ہوں وہاں زندگی کی روح پُر فشاں ہوتی ہے۔

"میرؔ" کا ایک شعر ہے:۔

کہا میں نے گل کو ہے کتنا ثبات • کلی نے یہ سُن کر تبسم کیا

"مصحفی" نے بھی اسی خیال سے بہت مشابہ ایک خیال کا اظہار کیا ہے:

چلی بھی جا جرس غنچہ کی صدا پہ نسیم
کہیں تو قافلۂ نوبہار ٹھہرے گا

یہ شعر ایک ایسی مضراب ہے جس کی تندی اور تیزی نے شعور جمال کے تاروں کو لرزا دیا ہے اور یہ ایک ایسی کیفیت ہے جس کو نہ صرف حسن بلکہ تلاش حسن بھی کہہ سکتے ہیں اس شعر کے چند چند پہلو ہیں۔ قافلۂ نوبہار کی روانگی کے اظہار میں صرف اسلوب نگاری کا تعاون حاصل کیا گیا ہے اور شعر کے معنوی گوشہ میں شعور حسن کا المیہ اور منفی پہلو جھلک رہا ہے مگر "کہیں تو" کا ٹکڑا شعور حُسن کے اثباتی امکانات و میلانات کو تقویت بخشتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ پورے شعر کی کچھ ایسی کیفیت ہے کہ جیسے ایک رنگ آئے اور ایک رنگ جائے۔

شعر:۔ چہرے پہ تازگی سے ہے جوش شکست رنگ
یہ تازہ گل ہے لالہ فروش شکست رنگ

"تازگی" سے شکستگیٔ رنگ کی کیفیت سلبی انداز کی حامل ہے مگر جہاں اس شکستگیٔ رنگ سے ایک حسین آزردگی" اور "افسردگی" کا احساس ہوتا ہے، وہیں اس تازہ گل کو لالہ فروش شکست رنگ" کہہ کر حُسن کے اثباتی شعور کا ثبوت دیا ہے۔ حُسن کی دلنوازی سے تو کسے انکار ہے مگر احساس حسن کے ساتھ کبھی کبھی پیدا ہونے والا احساس نارسائی بھی کچھ کم حسین نہیں ہوتا۔ "عرفی" نے اسی جذبے سے متاثر ہو کر کہا تھا۔ شعر

آہ ازیں حوصلۂ پست واز آں حسن بلند
کہ دلم را گلہ از حسرت دیدار تو نیست

"مصحفی" کہتے ہیں۔ شعر

اور سب تم سے ورے بیٹھے ہیں • ایک ہم ہیں کہ پرے بیٹھے ہیں

"حسن" "احساس حسن" اور احساس نارسائی انھیں تین اجزا سے "عرفی" اور "مصحفی" کے شعر کی ترکیب عمل میں آئی ہے مگر عرفی کے شعر میں اندوہناک یاسیت نے احساس حسن اور احساس نارسائی کی کیفیات کو تو باقی رہنے دیا ہے مگر خود حُسن کو پوشیدہ کر دیا ہے۔ مگر "مصحفی" کی نیم یاسیت نے حُسن، احساس حسن، احساس نارسائی تینوں حالتوں کو ابہام اور اظہار کی ملی جلی کیفیات کے ساتھ برقرار رکھا ہے اور یہی ہے وہ جمالیاتی بصیرت جس کی ہم داد دینا چاہتے ہیں۔ تناسب یا موزونیت سے یہ مطلب ہوتا ہے کہ حسن کی مخصوص حالت جس طرح اور جہاں پائی جاتی ہے اس کو وہیں اور اسی طرح پایا جانا چاہئے شام کی دلفریبی اور صبح کی رعنائی کا معیار قطعاً مختلف ہے جرمنی کے ایک جمال پرست شاعر وابن اوزنے نے اپنے ایک شعر میں اس نظریۂ جمال کی بہت ہی حسین تشریح کی ہے:۔

بیضاء باکرھا النعیم فصاغھا۔ بلباقۃ فادقھا واجلھا۔

وہ آسودہ حال گھرانے کی چشم و چراغ دوشیزہ ایسا مرمریں حسن ہے جس کو مسرت اور آسودہ حالی نے پرکارانہ چابکدستی کے ساتھ تناسب کے سانچے میں ڈھال دیا ہے۔ اس پیکر کے جس نقش میں نزاکت و جمال پائے جانے چاہئیں وہاں نزاکت و جمال کو پیدا کر دیا ہے اور جس نقش کو عظمت و جلال کی ضرورت ہے وہاں عظمت و جلال۔ "مصحفی" نے بھی اس حقیقت کی اس طرح تائید کی ہے:۔ شعر

ترے چہرے کے ہنگام تماشہ دل دھڑکتا ہے
نگاہیں سخت ہیں بے باک اور رخسار نازک ہیں

اس غزل کے ایک شعر میں انھوں نے شعوری طور پر اجتہادی شان کے ساتھ اس خیال کو دوسرے انداز میں پیش کیا ہے۔ شعر

نزاکت عاشق و معشوق کی یکساں نہیں ہوتی
مری گفتار نازک ہے تری رفتار نازک ہے

کس قدر واضح اور صریح انداز میں معیار جمال متعین کیا ہے اس مصرعے میں حقیقتاً حسن اور نظریات حسن کی تمام تر تفصیلات مضمر ہیں۔ "مصحفی" کے مشہور زمانہ حریف "انشا" نے اپنے احساس حسن کی ناپختگی کی بنا پر اس منزل میں آکر ٹھوکر کھائی ہے ان کی خارجیت پسندی ان کے سامنے حسن کے ہفت رنگ ضرور پیش کرتی ہے مگر ان کا سطحی احساس ان کی ناکردہ کاری پر شورہ دینے سے عاجز رہتی ہے کہ کس نقش کے لئے کون سا رنگ مناسب ہے اور اسی بے سلیقگی کی بنا پر معاملہ یہاں تک پہنچا ہے۔

شعر:۔ گر نازنیں کہے کا برا مانتے ہیں آپ
میری طرف تو دیکھئے میں نازنیں سہی

"مصحفی" نے یقین اور قطعیت کے ساتھ کہا تھا کہ "نزاکت عاشق و معشوق کی یکساں نہیں ہوتی" مگر "انشا" نے صرف اسلوبیاتی حسن پیدا کرنے کے لئے اس کے امکانات نہ صرف تسلیم کر لئے بلکہ پیدا کر دیئے اور کہہ دیا کہ میں نازنیں ہی تصور حسن بھی اسی قدر حسین ہے جس قدر حسن، ہم جتنا کچھ دیکھ رہے ہیں اس سے کہیں زیادہ دیکھ چکے ہیں کاروان رنگ و نور کے کہکشانی دھندلکوں کا بہت مختصر سلسلہ ہمارے سامنے ہے اور باقی تو غبار شام و سحر میں گم ہو چکا ہے ان کیفیات سے پیدا ہونے والے احساس کو یادآوری تذکر (RECOLLECTION) یا تصوری جمالیت کہتے ہیں۔ "مصحفی" پر بارہا اس قسم کے احساس کی آسودہ و ناآسودہ کیفیات طاری ہوئی ہیں۔

(باقی)

تبصرے

خلیل الرحمٰن اعظمی

متاعِ کلیم

مصنف : کلیم احمد آبادی
ناشر : کلیم بک ڈپو ۔ احمد آباد
قیمت : چار روپے

حضرت کلیم احمد آبادی گجرات کے ایک بزرگ اور کہنہ سال شاعر ہیں جن کی عمر اس وقت اسّی سال سے زائد ہے۔ ۱۸۹۴ء عیسوی میں شعر گوئی کا آغاز کیا جب اُردو شاعری پر داغ اور امیر چھائے ہوئے تھے۔ لیکن کلیم صاحب اپنے استاد عزیز مرحوم کے اثر سے جن کا سلسلۂ شاعری رضوان علی خاں مراد آبادی کے واسطے سے غالب تک پہنچتا ہے ابتدا ہی سے سنجیدہ شاعری کی طرف متوجہ رہے۔ کلیم صاحب غزل کے شاعر ہیں اور تغزل کے آداب کو پورے طور پر برتتے ہیں لیکن ان کی غزل کا دائرہ وسیع ہے اور ان کے لہجے میں وقار و تمکنت ہے۔ شروع میں ان کا کلام "پیامِ یار" اور دوسرے گلدستوں میں چھپتا رہا لیکن روایتی اور کتابی شاعری اور غزل گوئی کی عام ڈگر سے ہٹ کر شعر کہنے کی روش ان میں ہمیشہ برقرار رہی۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ہر دور کے شعور کا ساتھ دیا اور آج بھی ان کی غزل دور کی آواز نہیں معلوم ہوتی۔

ہر طرح مطمئن ہیں مگر اے شعورِ زیست
اک زخم خوردہ دل کی اذیت کہاں سے لائیں

یوں منہمک ہیں کارگہِ خیر و شر میں ہم
موت آئے بھی تو مرنے کی فرصت کہاں سے لائیں

عجیب منزلِ سوز و گداز ہے راہی ● ذرا سکون ملا ہے تو دل دھڑکتا ہے
لے نازکہ عذاب تو دکھا اپنی شوخیاں ● مدت ہوئی نام خدا کا لئے ہوئے

اہلِ دل کو نسبت ہے کوہ و دشت و صحرا سے
جس طرف وہ جاتے ہیں زندگی برستی ہے

زمانہ دیکھئے کیا اپنی چال چلتا ہے
فنا کے رُخ پہ لگا دی ہے زندگی میں نے

ہر لحظہ اک سکون تھا ہر لمحہ اک تسلی
کیا آپ بولتے تھے دل کی شکستگی میں

ساقی ترا کرم ہے مگر اس کا کیا علاج
ٹھہرے نہ جام جبکہ کفِ رعشہ دار میں

کلیم صاحب نے جہاں اپنے دائرۂ تغزل کو محض حسن و عشق تک محدود نہیں رکھا وہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ ان کے یہاں زندگی سے محبت اور مسائلِ حیات سے آنکھیں چار کرنے کا حوصلہ ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں ایک صالح اور صحت مند نقطۂ نظر ملتا ہے ان کے مجموعۂ کلام میں تنوع اور رنگا رنگی اور ان کے اندازِ بیان میں تازگی اور شگفتگی ہے۔ زبان و بیان اور فنی مہارت کے اعتبار سے بھی ان کے کلام میں ایک استادانہ شان ملتی ہے۔ امید ہے غزلوں کا یہ مجموعہ دنیائے ادب میں توجہ کا مستحق سمجھا جائے گا۔

میخانہ

مصنف : برج موہن طوفاںؔ دہلوی
ناشر : مکتبۂ قصرِ اُردو۔ اُردو بازار دہلی
قیمت : سوا دو روپے

برج موہن طوفان ایک نوجوان اور نوخیز شاعر ہیں جو دنیائے شاعری میں اپنا پہلا تعارف اپنے مجموعۂ کلام "میخانہ" کے توسط سے کرا رہے ہیں۔

"میخانہ" کے عنوان سے ابتدا میں ان کی ایک طویل نظم شامل ہے۔ اس نظم کی ہیئت تو وہی پرانی ہے یعنی مختلف قطعات کو مربوط کر کے اسے ایک نظم کی شکل دے دی لیکن اس میں طوفان صاحب نے اپنی زندگی کے تجربات اور موجودہ دور میں نوجوان فنکار کی جد و جہد کو موضوع بنایا ہے جہاں طرح طرح کے تصورات اس کا پیچھا کر رہے ہیں۔ بعض قطعات اچھے ہیں لیکن چند صفحے پڑھنے کے بعد یکسانیت اور تکرار کا احساس ہوتا ہے اور طبیعت اُلجھنے لگتی ہے۔ غزل میں بھی ابھی طوفاںؔ صاحب مشق کے دور سے گزر رہے ہیں۔ بعض بعض شعروں پر نگاہ ٹھہر جاتی ہے۔

دامنِ گل میں بھی قرار نہیں ● کتنا نازک مزاجِ شبنم ہے

خدا رکھے سلامت نسبتِ ساقی کو اے طوفاںؔ
زباں پہ اب غمِ دنیا کے افسانے نہیں آتے

حصۂ غزل کے بعد تین اور نظمیں شامل ہیں "جشنِ جمہوریت" "زیر و بم" اور "تیرے بغیر"۔ تینوں نظمیں ایسی ہیں جو جدید نظم گوئی سے کوئی مناسبت نہیں رکھتیں۔ ان کا انداز ۱۹۳۵ء سے پہلے کی نظم نگاری سے قریب ہے۔ آخر میں کچھ قطعات ہیں۔ ان قطعات پہ نامکمل غزلوں کا گمان گزرتا ہے اور بعض ایسے ہیں جن کا خیال بھی نیا نہیں بلکہ غزل سے برآمد ہوا ہے۔

مجھ سے طوفاں ان کی محفل میں
شرحِ رازِ حیات ہو نہ سکی
بات کرنے کی آرزو تھی مگر
سامنے جا کے بات ہو نہ سکی

طوفاںؔ صاحب کو چاہئے کہ فنِ شعر پہ سنجیدگی سے توجہ کرنے سے قبل اُردو شاعری کے ارتقا اور اس کے رنگ و آہنگ کا مطالعہ کریں اس کے بعد اپنی راہ متعین کریں۔ کہیں ان کا حال اس موجد کا سا نہ ہو جسے ایجاد کا شوق تو تھا لیکن ایجادات کی تاریخ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بڑے خلوص اور جگرکاوی کے بعد اس نے جو چیز ایجاد کی وہ ریل کا انجن تھا جسے صدیوں پہلے جارج اسٹیفنسن نام کا ایک اور موجد ایجاد کر چکا تھا۔

پبلشر نذیر حسن پرنٹر ضمیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھپوا کر مرکزی انجمن سے شائع کیا۔